رتن ناتھ سرشار کا ہمزاد نواب سید محمد آزاد

پروفیسر محمد کاظم

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

کس قدر دل سے فراموش کیا عاشق کو

نہ کبھی آپ کو بھولے سے بھی میں یاد آیا

(امانت لکھنوی)

تلخیص: سید محمد آزاد نے ایک فرضی کردار کو اپنے نام سے موسوم کر کے، اس کی خود نوشت تحریر کی ہے، پھر اس کردار کے ذریعے معاشرے کی اخلاقی پستی، زبوں حالی اور جہاں جہاں کمزوری نظر آئی اس کی طرف طنزیہ اشارہ کر کے ایک معاشرتی اور تہذیبی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ ایک طنزیہ ناول ہے جس میں سید محمد آزاد نے ہندوستان کی نئی نسل کی ابتری اور اس کی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد کی شکل میں لیڈر، وکیل، ایڈیٹر، حکام اور مذہبی رہنما کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس ناول میں پیش کر دیا ہے۔ اس سے قبل نذیر احمد نے 'ابن الوقت'، رتن ناتھ سرشار نے 'فسانہ آزاد' اور منشی سجاد حسین نے 'حاجی بغلول'، جیسے ناول تو تحریر کیے، اس میں بعض اوقات طنز و مزاح کے عناصر بھی ملتے ہیں لیکن کوئی مکمل اور خالص طنزیہ ناول مزاحیہ انداز میں نہیں ملتا،

کلیدی الفاظ : خود نوشت، ظرافت، اودھ پنچ، سیاست، مستقل، مضمون، تہذیبی خدمت، مکمل، 'فسانہ آزاد، اخلاقی پستی، اہمیت، طبع آزمائی

اودھ پنچ، لندن پنچ کے طرز پر اردو کا ایک مزاحیہ ہفت روزہ تھا جسے منشی سجاد حسین نے 16 جنوری 1877 کو لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ اخبار سیاست کو ظرافت کا جامہ پہنا کر پیش کرتا تھا۔ اس کے مستقل قلم کاروں میں مرزا محمد مرتضی عرف مٹھو بیگ عاشق (قلمی نام ستم ظریف)، نواب سید محمد آزاد، پنڈت تربھون ناتھ، منشی جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، منشی احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی، جیسے اہل قلم اہمیت کے حامل ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور سید محمد آزاد ایک دوسرے کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ دونوں کی سال پیدائش بھی ایک ہی ہے۔ دونوں کی تحریر میں طنز و ظرافت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان میں سید محمد آزاد ہمہ جہت فنکار ہیں۔ انھوں نے کئی اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ ان اصناف میں اپنی طرز کا اولین فن پارہ تخلیق کیا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ جان لیں کہ نواب سید محمد آزاد ہیں کون؟

رشید احمد صدیقی اپنے مضمون اکبر پر ایک نظر میں لکھتے ہیں:

''اکبر کے ساتھی نواب سید محمد آزاد تھے، جن کی تحریریں عام لوگوں کی نظروں کے سامنے نہیں آئی ہیں۔ اکبر جو کام نظم سے لے رہے تھے نواب سید محمد اپنی نثر سے لے رہے تھے۔ اردو نثر میں تین بڑے جید آزاد گزرے ہیں محمد حسین آزاد، نواب سید محمد آزاد، ابوالکلام، وہ تینوں اپنے اپنے اسلوب کے امام ہیں، لیکن ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز، ہونے کے اعتبار سے میں نواب سید محمد آزاد کا بڑا احترام کرتا ہوں!''

(رشید احمد صدیقی، اکبر پر ایک نظر نقش ہائے رنگ رنگ، صفحہ۔70)

(رشید احمد صدیقی، اکبر پر ایک نظر علی گڑھ میگزین اکبر الہ آبادی نمبر صفحہ-13)

رشید احمد صدیقی نے یہ جملے نواب سید محمد آزاد کی ظرافت کا اکبر کی ظرافت سے تقابل کرتے ہوئے تحریر کیے تھے۔ یہاں رشید احمد صدیقی نے تین آزاد کا ذکر کیا ہے اور ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے غزل سے متعلق جو بات کہی ہے اس سے نہ صرف اردو کا ہر قاری واقف ہے بلکہ اسے نقل کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے بالکل اس طرح سید محمد آزاد سے متعلق یہ جملے اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات سے پوری اردو دنیا واقف ہے لیکن نواب سید محمد آزاد کی خدمات سے ناواقفیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر غور کیا جائے تو شاید اس کی چار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے نام کے ساتھ مولانا نہیں ہے۔ دوسری انھوں نے انگریزی سرکار میں ملازمت کی۔ تیسری خالص اردو کی دنیا سے دور ڈھاکہ اور کلکتہ میں مقیم رہے اور چوتھی اور سب سے اہم وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ان کے نام کے ساتھ نواب لگا ہوا ہے اور ہم نے مان لیا کہ دوسرے نوابوں کی مانند ان کی تخلیقات بھی انسانی زندگی اور سماج و ملک سے دور کسی خیالی دنیا سے متعلق ہو گی۔ جب کہ انھوں نے اردو میں طنز و مزاح کو فروغ دینے والے اور انگریز مخالف اخبار اودھ پنچ، میں بالکل ابتدائی زمانے سے ہی لاتعداد مضامین لکھے۔ ان کے مضامین اور دوسری نگارشات کا جائزہ لینے سے قبل ان کی زندگی کے حالات پر مختصر روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہو گا۔

سید محمد آزاد کی پیدائش بنگال کے قدیم شہر ڈھاکہ کے موسیقی کے رسیا اسد الدین حیدر اور نواب النساء خانم عرف بخشی بیگم کے گھر 1846 میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد نے کی اور پھر اردو و فارسی کی تعلیم انھوں نے مرزا غالب کے ساتھ ادبی معرکہ آرائی کے شہرت یافتہ موئید برہان کے مصنف آغا احمد علی اصفہانی جو اس وقت ڈھاکہ میں ہی مقیم تھے، سے حاصل کی۔ آزاد چونکہ بچپن ہی سے ذہین تھے اس لیے کم سنی ہی میں مشرقی علوم سے فارغ التحصیل ہو گئے۔

سید محمد آزاد کو اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی برابر کا عبور حاصل تھا۔ انھوں نے انگریزی کی تعلیم اس وقت کے مشہور و معروف ڈھاکہ کالج سے حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا لیکن کچھ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ دوران تعلیم ہی آپ کے والد نے آپ کو کلکتہ روانہ کر دیا۔ انھوں نے اپنی بقیہ تعلیم کلکتہ میں پوری کی۔

سید محمد آزاد کی تعلیمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے جب وہ صرف 27 برس کے تھے تو 1873 میں برطانوی حکومت نے سب رجسٹرار کے عہدے پر تقرر کیا۔ ان کے کام کی لگن اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے مسلسل ترقی ملتی رہی یعنی 1880 میں ڈپٹی مجسٹریٹ بنا دیے گئے اور پھر اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر

فائز ہوئے۔اس زمانے میں بنگال، بہار اور اڑیسہ ایک ہی پروونس میں آتا تھا اور اس پورے پروونس کے ایک ہی افسر ہوا کرتے تھے۔اس طرح 28 جنوری 1907 کو بنگال، بہار اور اڑیسہ پروونس کے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن مقرر کیے گئے اور یہیں سے 1912 میں 39 برس کی خدمات کے بعد نوکری سے سبکدوشی حاصل کی۔ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اس وقت کی حکومت نے کئی اہم عہدوں پر فائز کرنے کے ساتھ ساتھ کئی قابل قدر خطابات سے نوازا جن میں 26 جون 1902 کو خان بہادر اور یکم جنوری 1909 کو نواب کے خطابات اہمیت کے حامل ہیں۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کی زندگی بھی انھوں نے کلکتہ میں ہی گزاری اور کم و بیش ستر سال کی سرگرم اور کشمکش سے بھری زندگی گزارنے کے بعد 11 دسمبر 1916 کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ سید محمد آزاد کو اردو، فارسی اور انگریزی پر یکساں دسترس حاصل تھی۔اس طرح انھوں نے اپنا پہلا مضمون فارسی زبان میں لکھا جو محمڈن لٹریری سوسائٹی، کلکتہ کا فارسی زبان میں نکلنے والا ترجمان 'دوربین' میں شائع ہوا۔لیکن انھوں نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے قلم ہاتھ میں لیا تو انگریزی میں تحریر کیا۔کلکتہ نہ صرف اردو صحافت کی ابتدا کا مرکز رہا ہے بلکہ صحافت کا منبہ یہیں سے پھوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔لہذا نواب سید محمد آزاد نے کلکتہ سے شمبھو چندر ڈے کی ادارت میں شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ 'رئیس اینڈ رعیت' میں مدیر کی گزارش پر اس کا اداریہ لکھنا شروع کیا۔اس کے بعد اسی اخبار میں Mulaqat The کے عنوان سے انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید محمد آزاد کو نہ صرف لکھنے کا شوق تھا بلکہ اس زمانے کی مناسبت سے انگریزی حکومت کو نشانہ بنانے کے لیے طنز کے نشتر کو ظرافت کے شیر میں ڈبو کر عام قارئین تک پہنچانے کی ضرورت کا بھی احساس تھا اور یہ کام انھوں نے صرف انگریزی میں ہی نہیں بلکہ اردو میں بھی بخوبی انجام دیا۔

ہم سب واقف ہیں کہ اودھ میں نہ صرف اردو کے اخبارات شائع ہوئے بلکہ اردو میں طنز و مزاح کا نمائندہ اخبار بھی لکھنو سے ہی شائع ہوا۔لکھنو سے شائع ہونے والے 'اودھ اخبار' میں سید محمد آزاد کے مضامین وقفے وقفے سے 1874 تک شائع ہوتے رہے۔ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا اصل جوہر منشی سجاد حسین کے 1877 میں لکھنو سے جاری ہونے والے اخبار 'اودھ پنچ' سے کھلتا ہے۔اس اخبار کے جاری ہونے کی تاریخ سے لے کر جب تک یہ اخبار نکلا سید محمد آزاد نے مسلسل اس کے لیے مضامین، کالم اور دوسری تحریر قلم بند کرتے رہے۔ان میں سے چند تحریریں ان کے اصلی نام یعنی 'آزاد' کے نام سے شائع ہوئیں تو بہت سی تحریریں مختلف قلمی ناموں سے منظر عام پر آئیں۔ان میں سے چند نام دیکھیں:

مولانا آزاد، آزاد، نئی روشنی کا ہستی سوز چراغ، سعید ازلی، تیغ بے نیام، لیٹی خروس، محمد بصیر اللہ خان، تمدنی سوپیر، ایک اسی سالہ مجر فطرت، صوفیہ، خاص رپورٹر اودھ پنچ، تہذیب افروز بیگم، شہاب ثاقب وغیرہ

مختلف قلمی ناموں سے ان کی تحریریں شائع ہونے کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے اس لیے کچھ قابل اعتراض مواد قلمی ناموں سے قارئین تک پہنچاتے رہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک ساتھ کئی کئی چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں تو ان میں سے ایک ان کے اصل نام اور باقی قلمی یا فرضی نام سے شامل اشاعت ہوتی تھیں۔'اودھ پنچ' میں شائع ہونے والی تحریروں سے انھیں شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ادبی مقام بھی

حاصل ہوا۔ گویا 'اودھ پنچ' کا ذکر جب بھی ہوگا تو سید محمد آزاد کا نام ضرور لیا جائے گا۔ سید محمد آزاد نے اودھ پنچ میں جو کچھ لکھا وہ نہ صرف اردو ادب کے خزانے میں اضافہ ثابت ہوا بلکہ ملک و سماج کے لیے بھی اکسیر کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ 'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں پر گفتگو کرتے ہوئے سید محمد آزاد کے حوالے سے اردو کے بے باک ناقد کلیم الدین احمد کا کہنا ہے:

''دوسرے گروپ میں وہ ظرافت نگار آتے ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے جو بعض چیزوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں یا جو کسی خاص مشاہدہ سے متاثر ہو کر اپنے جذبہ غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس گروپ میں پنچ کے لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے۔ انھوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ وہ بھی مغربیت کے خلاف تھے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے۔ لیکن اردو نثر میں اتنی ممتاز کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی اکبر کو نظم میں میسر ہوئی۔۔۔۔۔۔ آزاد کے زمانے کا لحاظ کر کے اور یہ بھی مد نظر رکھ کر کہ ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ اردو میں موجود نہ تھا ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں لیکن ان کی اہمیت تاریخی ہے اور ان سے ادب و انشاء لب و لہجہ کے متعلق موجودہ زمانے کے نوجوان مزاح نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

(کلیم الدین احمد، سخنہائے گفتنی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر 1955، صفحہ 234-35)

کلیم الدین احمد جیسے سخت تنقید نگار جن الفاظ میں سید محمد آزاد کی تحریر پر اظہار خیال کرتے ہیں وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ نوجوانوں کے لیے راہنما بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے سید محمد آزاد کے اسلوب کا خاصا اثر قبول کیا۔ کلیم الدین احمد نے ایک اور انگریز ملازم شاعر اکبر الہ آبادی سے ان کا تقابل کیا ہے اور بجا کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کی بات کو ہی آگے بڑھاتے ہوئے طنز و مزاح کے حوالے سے ایک اہم ناقد فرقت کاکوروی کا خیال سید محمد آزاد کی تحریر کو دیکھنے کی جانب مزید رہنمائی کرتا ہے۔ غلام احمد فرقت کاکوروی کہتے ہیں:

''اودھ پنچ کے تمام لکھنے والے نثر نگاروں میں ان (نواب سید محمد آزاد) کا درجہ سب سے بلند ہے۔ وہ بھی اپنے دور کے لکھنے والوں کی طرح مشرق کے دل دادہ اور مغرب کے مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنے دور میں نثر نگاری میں ویسی ہی شہرت حاصل کی جو اکبر نے نظم میں حاصل کی۔ ان کے طنز کی تان بھی سیاست اور معاشرت پر ٹوٹتی ہے۔ ان کی ظرافت رکاکت کہنہ اور ہجویات سے پاک ہے اور وہ سیدھے سادے انداز میں طنز کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظرافت اور شوخی اور ادب کے چٹخارے ملتے ہیں اور وہ ایک معیاری زبان لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں زور بیان کہیں کہیں ان حدوں میں بھی داخل ہو گیا ہے جہاں مسکرا کر انسان دانت میں انگلی دبا لیتا ہے مگر اس دور کے مذاق پر یہ چیز اتنی بار تھی جیسی کہ ہم اسے اس وقت محسوس کرتے ہیں کیونکہ ستر پچھتر سال قبل ظرافت کا معیار موجودہ معیار سے بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔''

(غلام احمد فرقت کاکوروی، اردو ادب میں طنز و مزاح، صفحہ 74-173)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید محمد آزاد نے نہ صرف طنز و مزاح کے خاص اسلوب کی طرح ڈالی بلکہ اس زمانے کی مناسبت سے ایک خاص انداز و اسلوب میں قارئین کی دلی اور ذہنی تربیت بھی کی۔ چونکہ ان کا تعلق ایسی ملازمت سے تھا جہاں زمینی حقیقت معلوم ہوتی رہتی تھی اور وہ ان حقیقت سے ہندوستانی

عوام کو آگاہ کرنے کا کام کر رہے تھے۔ان کی تحریر کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کرنے کا کام عبدالغفور شہباز نے انجام دیا۔نواب سید محمد آزاد کی کتابوں پر تحریر کیے گئے پیش لفظ اور مقدمے نہ صرف آزاد کی ادبی خدمات اور اس کے معیار کا تعین کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں بلکہ خود شہباز کی ادبی کاوشوں اور ان کی ادب شناشی کی مثال پیش کرتے ہیں۔

عبدالغفور شہباز نے نواب سید محمد آزاد کی تحریروں کو وقفے وقفے سے تین کتابوں میں پیش کیا اور یہ تینوں کتابیں صنفی اعتبار سے اپنے طرز کا اولین نمونہ ہیں۔آیئے ان پر مختصر گفتگو کر لی جائے۔

خیالات آزاد:

خیالات آزاد سید محمد آزاد کے اودھ پنچ، لکھنو میں شائع شدہ طنزیہ و مزاحیہ نگارشات کا مجموعہ ہے۔ان مضامین میں آزاد نے معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔انھوں نے اس خوبی سے اپنی انگلی کا استعمال کیا ہے کہ قاری کو تکلیف ہونے کے بجائے تبسم ریز ہو کر سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔اس مجموعہ کو عبدالغفور شہباز نے فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ 1887 میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع کرایا۔یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور جلد ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔شہباز صاحب نے اس بار خیالات آزاد کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ شائع نہیں ہو سکا۔ہاں جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1908 میں رضوی پریس، کلکتہ سے شائع ہوا تو ان کے مرتبہ دوسرے حصے کو بھی اس انتخاب میں محمد عبدالحمید نے شامل کر لیا۔خیالات آزاد کے 1887 کے ایڈیشن کا سرورق اس طرح ہے:

ہنوز آں ابر رحمت در فشان است

خُم و خُم خانہ بامہر و فشان است

خیالات آزاد یعنی مولانا آزاد کی ڈکشنری، خمارستان کے ڈنر، نامئہ و پیام، ولایت کے شوق سفر نامے، اشتہار مسرت بار، اور ستائش نیچر کا اخلاق آموز، دانش افروز، فصاحت اندوز، دل کش مجموعہ جس کو شاعر حقیقت طراز مولوی سید محمد عبدالغفور صاحب شہباز، سابق ایڈیٹر اخبار دارالسلطنتہ و جریدہ نمایش و نور بصیرت و جامع موعظئہ حسنہ و مصنف مثنوی چہار عشق و پنجئہ خورشید و مسدس شہباز وغیرہ وغیرہ نے بترتیب معقول مرتب فرمایا۔پہلی طبع

۱۸۸۷ع مطبع قومی پریس واقع شہر نزہت بہر لکھنؤ چوک،

خیالات آزاد کے پہلے ایڈیشن میں ایک اشتہار شامل ہے جس میں کتب زیر ترتیب کے تحت تین کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں پہلی کتاب خیالات آزاد کا دوسرا حصہ شامل ہے۔یہ حصہ الگ سے تو شائع نہیں ہو سکا ہاں خیالات آزاد کے دوسرے ایڈیشن (1908) میں محمد عبدالحمید (198 لور چیت پور روڈ، کلکتہ) نے شامل کر لیا ہے۔خیالات آزاد سے متعلق مرتب عبدالغفور شہباز لکھتے ہیں:

''(خیالات آزاد) اس آزادی کی عمدہ تاثیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس نے اس کی عمدہ تاثیر سے پوری طرح استفادہ کر کے اپنی طبعی ذکاوت و ذہانت اور فطری مادہ قابلیت کو کامل طور پر چمکایا۔اور مشرقی انشاپردازی کے اکھاڑے ہیں مغربی اصول سے جواں مردانہ قدم رکھ کر اکثر اعلیٰ

درجے کے زور آزماؤں کو صاف نیچا دکھایا۔ یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کا قلم آزادر قم زمانہ دراز تک اخبار نویسی اور وقائع نگاری کی عمارت کا ایک محکم اور استوار ستون رہا ہے۔ عالم انشاپردازی پر اس شخص کا اس قدر بڑا احسان ہے کہ فرنگستان میں شاید مکالے کارلائل اور گولڈ اسمتھ کا بھی اتنا ہی ہو۔ اس شخص نے اپنی وسعت خیالات کے مطابق بزور ذہانت، ذکاوت اردو کی انشاپردازی کے تنگ کوزے میں وہ گنجائش نکالی کہ دریا کیا، دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی سمائی نظر آئی۔''

(خیالات آزاد، عبدالغفور شہباز، پہلا ایڈیشن 1887، صفحہ 4)

جیساد کہ سرورق سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب میں آزاد کی مختلف تحریریں شامل ہیں۔ یہاں ان پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔ اس کتاب کا ابتدائی حصہ سید محمد آزاد کی ڈکشنری پر مشتمل ہے۔ اس ڈکشنری میں آزاد نے اس زمانے کی روش اور انگریزوں کی تہذیب و ثقافت پر گہرا طنز، مزاح کے قند کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی اس ڈکشنری سے صرف دو مثالوں کے ساتھ اپنی گفتگو کو آگے لے کر چلوں گا:

سویلزیشن (تہذیب): اپنے ہم وطن کو نیم وحشی جاننا۔ اپنے بزرگوں کو اولڈ گوس (پرانا قاز) کہنا۔ جاکٹ پتلون پہننا۔ سڑک پر چلتے وقت سیٹی بجانا۔ چھڑی ہلانا۔ اور بوٹ پٹکنا۔ آلو کھانے کا شوق۔ شراب پینے کا ذوق۔ دم دار ٹوپی کا استعمال، گردن مروڑی مرغی حلال۔ البرٹ فشن سے بالوں کو ترشوانا۔ تیل کے عوض ریچھ کی چربی سر میں لگانا۔ ولایت سے میم لانا۔ انگریزی جانیں یا نہ جانیں مگر اخبار پڑھنا۔ ہارمونیم کی گت پر برانڈی کی دھن میں پیپروں سے تال دے دے کر ناچنا۔

پارلیمنٹ: مدبروں کا آشیانہ، فصحا اور بلغا کی پرورش کا زچہ خانہ کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کے تماشا دکھانے کا تھیٹر، وہ پالی جہاں کا اصیل اور ٹینی دونوں کٹر، زبانی لڑائی کا میدان، خیالی پلاؤ بیچنے والے کی دکان، باہمی نفاق اور ذاتی رشک و حسد کا تنور، خیالی اور لسانی کشتی کا مہذب اکھاڑا، تمدن کے دنگل میں حکمت عملی کے مطابق وزرا کے چیت پٹ ہو جانے کا سہارا۔

مکتوبات آزاد:

خیالات آزاد میں ڈکشنری کے بعد مختلف حیثیتوں سے لکھے گئے کل پندرہ خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برطانیہ سے لکھے گئے ہیں جن میں مغربی تہذیب و معاشرت کے بہت سے پہلوؤں پر ناقدانہ اور منصفانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نواب سید محمد آزاد کو ہندوستان سے باہر جانے کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن اپنے مطالعے، ذہانت اور زور قلم سے بہتوں کو اس مغالطے میں مبتلا رکھا کہ وہ لندن گئے تھے۔ اس مغالطے کی بنیاد ان فرضی خطوط پر ٹکی ہے جو انھوں نے خیالی طور پر لندن سے ''نامہ پیام'' کے عنوان سے لکھے ہیں۔ ان خطوط کی دل چسپ بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں پڑھنے کے بعد کوئی بھی بلا تامل اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ سید محمد آزاد نے قیام لندن کے دوران ہی انھیں ارسال کیا ہے۔ کیونکہ ان خطوط میں انگلینڈ کی فضا، موسم، عام حالات، روزمرہ کی زندگی، یہاں تک کہ برطانیہ کی گلوں اور شاہراہوں تک کی عکاسی اس فن کاری سے کی گئی ہے کہ قاری کو آزاد کے سفر لندن سے انکار کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ مثال کے طور پر 30 جولائی 1878 کو عفت بیگم کے نام ایک خط کا یہ حصہ دیکھیں:

مائی ڈیر عفت بیگم

جب سے میں تم کو چھوڑ کر لندن آیا ہوں ہمیشہ تمھارے بزرگوں کے اور محلے کے احباب کے خطوط میرے نام آتے ہیں۔ میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریہاو مرسلہا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندر بمبئی سے جہاز دخانی پر چڑھنا کہ تمھاری فرقت مجھ پر سوار ہوئی۔ اکثر راتوں کو جہاز میں تمھارے گیسوئے مشکیں موباف سرخ تنگ و چست کلی دار پاجامے اور اکرئی ململ کے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا۔ حتّٰی کہ آنکھ ذرا جھپکی اور خواب میں تم موجود۔ لیکن جب سے کہ اس طلسماتی شہر لندن میں قدم رکھا ہے روز بروز صد مئہ مفارقت گھٹتا گیا۔ اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔''

(خیالات آزاد، عبدالغفور شہباز، پہلا ایڈیشن 1887، صفحہ 32-33)

آگے چل کر اسی خط میں سید محمد آزاد ہندوستان اور برطانیہ کی خواتین کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب کسی فرنگن کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے، مجھے تمھارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی کی میم کو کسی دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں، تمھاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ جب کسی خاتون کو اٹا کھیلتے وقت پھرتی سے منی پوری ٹانگھن کی طرح تڑپ جاتے دیکھتا ہوں اور تمھارا مریضانہ اور نخرے سے کمر کو سو جگہ سے خم دینا اور چوکی پر سے طاق تک عطر لانے جانا یاد ہوتا ہے تو دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار، رفتار اور ذہانت اور جودت سے بیس بیس جنٹلمین یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت اس کا تاسف ہوتا ہی ہے کہ تم تو میرے عزیز مردوں کو دیکھ کر اس طرح سے مرجھا جاتی تھیں جس طرح لجالو۔''

(خیالات آزاد، عبدالغفور شہباز، پہلا ایڈیشن 1887، صفحہ 34)

درج بالا متن کے مطالعے سے ایک جانب یہ احساس ہوتا ہے کہ آزاد حقیقت میں یہ خط لندن سے تحریر کر رہے ہیں تو دوسری طرف ایک خاص انداز میں ہندوستانی اور برطانوی خواتین کا تقابل پیش کر رہے ہیں۔ بظاہر وہ برطانوی خواتین کی تعریف کر رہے ہیں لیکن اصل میں ہندوستانی تہذیب اور خواتین کے مہذب ہونے کو بیان کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے انسانی رشتوں اور اقدار سے متعلق ان کے خیالات مختلف خطوط میں موجود ہیں۔

خیالات آزاد میں مختلف موضوعات پر شامل مضامین نہ صرف جدت موضوع اور اسلوب کا حامل ہے بلکہ تصنع، تکلف اور آورد سے گریز کرتے ہوئے سید محمد آزاد طنز و مزاح کے پیرائے میں بے ساختہ اور بلا تکلف اپنے خیالات بیان کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال نہ صرف سید محمد آزاد کے معاصرین بلکہ بعد کے طنز و مزاح نگاروں کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔

سوانح عمری مولانا آزاد:

سید محمد آزاد کی دوسری کتاب ''سوانح عمری مولانا آزاد'' ہے جو 1890 میں 'اودھ پنچ'، لکھنو میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد 1891 میں صبح صادق پریس، عظیم آباد سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس کا سرورق اس طرح ہے:

خوش تر باشد کہ سّر دلبران

گفتہ آید در حدیث دیگران

سوانح عمری مولناآزاد

مصنف خیالات آزاد کی جدید تصنیف جس میں شوخ طبع مصنف نے مولاناآزاد کی آڑ میں نئی روشنی کے چلتے پرزوں کے خوب خوب پرزے اُڑائے ہیں

مولوی سید محمد عبدالغفور شہباز کی حسن تصحیح سے صبح صادق پریس میں چھپی ۱۹۸۱ عظیم آباد پہلا چھاپہ ہزار جلد (کل حقوق محفوظ)

''سوانح عمری مولاناآزاد'' سید محمد آزاد کا ایک طنزیہ کارنامہ ہے۔ سید محمد آزاد کے معاصرین میں دو اور ناول نگار تھے جن میں ڈپٹی نذیر احمد پر مذہب کا اثر غالب تھا تو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ماحول نے انھیں لاابالی طبیعت بخشی تھی اور بے فکری ان کی طبیعت ثانی بن چکی تھی۔ ان میں سید محمد آزاد ہی ایسے ہیں جن کے یہاں بے انتہا سنجیدگی نظر آتی ہے۔ مزاج کا یہی فرق ان تینوں کی شخصیت اور اسٹائل کو الگ کرتا ہے۔

سید محمد آزاد نے ایک فرضی کردار کو اپنے نام سے موسوم کر کے، اس کی خود نوشت تحریر کی ہے، پھر اس کردار کے ذریعے معاشرے کی اخلاقی پستی، زبوں حالی اور جہاں جہاں کمزوری نظر آئی اس کی طرف طنزیہ اشارہ کر کے ایک معاشرتی اور تہذیبی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ ایک طنزیہ ناول ہے جس میں سید محمد آزاد نے ہندوستان کی نئی نسل کی ابتری اور اس کی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولاناآزاد کی شکل میں لیڈر، وکیل، ایڈیٹر، حکام اور مذہبی رہنما کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس ناول میں پیش کر دیا ہے۔ اس سے قبل نذیر احمد نے 'ابن الوقت'، رتن ناتھ سرشار نے 'فسانہ آزاد' اور منشی سجاد حسین نے 'حاجی بغلول'، جیسے ناول تو تحریر کیے، اس میں بعض اوقات طنز و مزاح کے عناصر بھی ملتے ہیں لیکن کوئی مکمل اور خالص طنزیہ ناول مزاحیہ انداز میں نہیں ملتا۔ اس ناول میں ظرافت کی جھلکیاں خوب دیکھنے کو ملتی ہیں اور تہذیبی تخریب کاری کا مکمل عمل ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے سید محمد آزاد کے اس ناول کو ایک اہم سرمائے کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ حالانکہ آزاد کو نذیر احمد، سرشار اور منشی سجاد حسین جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی لیکن انھیں ان تینوں پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ نذیر احمد کا ناول 'ابن الوقت' ایک تبلیغی ناول ہے، سرشار اور سجاد حسین کے ناول خالص مزاحیہ ہیں جب کہ نواب سید محمد آزاد کے ناول 'سوانح عمری مولاناآزاد' میں مزاح کے ساتھ طنز کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔ اس لیے اسے اردو کا پہلا خالص طنزیہ ناول کہا جانا چاہیے۔

نوابی دربار:

سید محمد آزاد کی ایک ڈرامائی تحریر 'نوابی دربار' کے عنوان سے ہفتہ وار 'اودھ پنچ' میں 1878 میں قسط وار شائع ہوئی۔ بعد میں اس ڈرامے کو عبدالغفور شہباز نے ترتیب دے کر کتابی صورت میں پہلی بار سیٹھ کندن لال پریس، لکھنو اور دوسری بار بال کشن پریس، آگرہ سے شائع کروایا۔ ان دونوں ایڈیشنوں پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔ ہاں دوسرے ایڈیشن کے دیباچے کے آخر میں شہباز صاحب کے نام کے ساتھ یکم اکتوبر 1901 ضرور درج ہے۔ نوابی دربار کے علاوہ ایک اور ڈرامائی تحریر 'لوفر کلب' کا ذکر ملتا ہے جو انھوں نے 1900 میں سپرد قلم کیا تھا۔ خیالات آزاد میں شامل اشتہار کے آخر میں نوابی

کھیل کا ذکر شامل ہے جس کے متعلق درج ہے کہ: 'کلکتے کے ہر حلقے کے چلتے پرزوں کی خوش فعلیوں کی ایک موثر اور دل کش تصویر۔ پیرایہ ظرافت' لیکن اب یہ دونوں ڈرامے دستیاب نہیں ہیں۔ عبدالغفور شہباز اپنے دیباچے میں ڈراما نوابی دربار کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس طرح ہندوستان میں 'اودھ پنچ' سب سے پہلا پرچہ ظرافت کا ہے اسی طرح اردو زبان میں 'نوابی دربار' سب سے پہلا فسانہ مکالمت کا ہے۔ فسانہ مکالمت سے مری مراد ڈراما ہے جس کو ہندی میں ناٹک کہتے ہیں۔

یہ فسانہ 16 اپریل 1878 سے چھپنا شروع ہوا۔ پورے چار مہینے تک چھپتا رہا کیونکہ 16 جولائی 1878 کو ختم ہوا۔ اس اثنا میں ناظرین اودھ پنچ کے شوق کی برابر یہ کیفیت رہی کہ گویا واقعی کسی اعلیٰ درجے کے تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ تماشا ہو رہا ہے، ٹکٹکی بندھی ہوئی ہے۔ نظارہ پلک جھپکانے کی اجازت نہیں دیتا۔''

(عبدالغفور شہباز، نوابی دربار، صفحہ 1)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'نوابی دربار' 1878 میں قسط وار شائع ہوا۔ اس تحریر کو 'فسانہ مکالمت' کہا گیا ہے اور بعد میں اسے ڈراما اور ناٹک کا متبادل بتایا گیا ہے۔ اس شائع ہونے والی تحریر کو تھیٹر میں بیٹھے ناظرین کی کیفیت ظاہر کرنے کے متبادل بتایا گیا ہے۔ اس تماشا کو ٹکٹکی باندھ کر نظارہ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہباز ڈراما کے فن اور تھیٹر سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے دانستہ اسے فسانہ مکالمت کہا ہے۔

عبدالغفور شہباز کے علاوہ چند محقق اور ناقدین نے 'نوابی دربار' کو اردو کا پہلا نثری ڈراما کہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نثر میں ہی نہیں بلکہ بنگال سے شائع ہونے والا پہلا اردو ڈراما سید ابوالفضل کا 'صولت عالم گیری' ہے۔ 150 صفحات پر مشتمل یہ ڈراما 2 اکتوبر 1876 کو شائع ہوا۔ اس سے پہلے بنگال سے ہی مولوی احمد حسین وافر کا منظوم ڈراما 'بیمار بلبل' 1867 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سید محمد آزاد کا ڈراما 'نوابی دربار' شائع ہوا۔ یہ تمام ڈرامے نثر میں لکھے گئے۔ اس طرح اولیت کا سہرا 'نوابی دربار' کے سر نہیں باندھا جا سکتا ہے۔ ہاں خالص طنزیہ و مزاحیہ پیرایے میں لکھا گیا پہلا ڈراما ضرور کہا جا سکتا ہے۔

نوابی دربار کے لکھے جانے کا وہ زمانہ ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان سے بادشاہت کا تو خاتمہ ہو ہی چکا تھا بہت سی ریاستوں سے نوابیت بھی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ان کی اولادوں کو اب بھی نواب ہونے کا مغالطہ تھا اور اسے بچائے رکھنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ گز بھر کے لیے تھان کھونے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک خاندان کو نوابی دربار کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اب اگر ڈرامے کے شائع شدہ متن پر نظر ڈالتے ہیں تو ڈرامے کے بالکل شروع میں 'مضامین نوابی دربار' کے عنوان کے تحت ڈرامے کے مناظر کی تقسیم بتائی ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سید محمد آزاد نے ایکٹ یا سین کے بجائے حصہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پہلا حصہ، دوسرا حصہ... آٹھواں حصہ۔ گویا انھوں نے دانستہ ڈرامے کی انگریزی اصطلاحات سے گریز کیا ہے۔ اسی طرح کردار کی فہرست پیش کرتے ہوئے انھوں نے 'اراکین نوابی دربار' کا عنوان لگایا ہے۔ یہاں انھوں نے مرد اور عورتوں کے ضمنی عنوان سے کرداروں کی الگ الگ فہرست پیش کی ہے۔

'نوابی دربار' کے پلاٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے نواب کی کہانی ہے جس کی جاگیر تو جا چکی ہے، ہاں نام کے نواب ضرور ہیں۔ ڈرامے کے شروع میں ایک ایسا ماحول تیار کیا گیا ہے کہ نواب صاحب نیند سے بیدار ہونے والے ہیں ان کے عیش وآرام کا سامان اور ضرورت کی چیزیں تیار کی جائیں۔ ہر ملازم ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اتنی دیر ہو گئی ابھی یہ کام نہیں ہوا، ابھی نواب صاحب آتے ہوں گے حقہ تازہ نہیں ہوا وغیرہ۔ اس حصے میں مصاحب، نوکر، منحوسی، سیہ بخت اور دڈا مجیدن کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے ایک جانب اس دور کی تہذیب وثقافت کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب ہلکے پھلکے انداز میں ایک دوسرے پر طنز بھی کسے جاتے ہیں۔

دوسرے حصے میں عدالت کا پیادہ نالش لے کر آتا ہے اور نواب صاحب گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سیہ بخت اور منحوسی کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ کوچبان کو گزشتہ ایک برس سے تنخواہ نہیں دی گئی ہے بلکہ کسی ملازم کو تنخواہ نہیں ملی ہے۔ کوچبان نے عدالت میں نالش کر دی ہے۔ دوسرے لوگ باتیں کرتے ہیں کہ شاید اس بہانے انھیں بھی تنخواہ مل جائے۔ نواب صاحب آکر میر زمانہ ساز کو بتاتے ہیں اور پیادہ ان سے رسید لینا چاہتا ہے تو میر زمانہ سازاسے رشوت دے کر خاموش کرا دیتے ہیں۔ پھر مختار صاحب کو بلانے کی بات کی جاتی ہے۔ وہ فوراً آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھوں نے اس کے لیے وکیل کر لیا ہے، گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میر صاحب اور خان صاحب نواب صاحب کو عدالت جانے سے منع کرتے ہیں کہ وکیل اوٹ پٹانگ سوال کرتے ہیں۔ خان صاحب ہائی کورٹ جانے کی بات کرتے ہیں۔ اس کے لیے فی الوقت ایک ہزار روپے کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وکیل کی فیس اور عدالت کے لوگوں کی فرمائش پوری کر سکیں۔ میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ اور میر جانی کو خان صاحب کے یہاں بھیجنے کی بات ہوتی ہے تاکہ گواہی کے لیے ان کی تیاری کرائی جا سکے۔

تیسرے حصے میں خان صاحب اور خجستہ بیگم کے درمیان گفتگو ہوتی ہے اور خان صاحب نواب صاحب کا بال بھی بیکا نہ ہونے دینے کی بات کرتے ہیں۔ بیگم خان صاحب سے کہتی ہے کہ جتنا روپیہ لگے، لگاؤ لیکن نواب صاحب کی عزت پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ چوتھے حصے میں خان صاحب اپنی بیگم سے آمدنی کی بات بتاتے ہیں۔ خان صاحب کی بیگم اپنی زندگی کی شکایت لے کر بیٹھ جاتی ہے کہ اس سے ان کا اور ان کے بچوں کا کب بھلا ہوا ہے۔ گویا وہ ایک روایتی بیوی کی طرح پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ بحث وتکرار کے بعد گالی گلوج تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اسی دوران میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ اور میر جانی آتے ہیں۔ اب چاروں مل کر نواب صاحب سے مزید چار ہزار روپے نکلوانے کا پلان کرتے ہیں۔ اس کے بعد خوشی میں افیون کی چسکی لیتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔

پانچواں حصہ کچہری کا ہے۔ خان صاحب غفور کوچبان سے مل کر اس کے بقایا ساٹھ روپے ادا کر کے اسے کیس چھوڑ کر چلے جانے کو کہتا ہے اور کوچبان اپنے پیسے لے کر پٹنہ ضلع چلا جاتا ہے۔ خان صاحب وکیل کے ساتھ عدالت میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ جب باری آتی ہے تو وکیل مدعی کے غیر حاضر ہونے کی صورت میں کیس کو خارج کرنے کی بات کرتے ہیں اور جج کیس خارج کرنے کا حکم سناتا ہے۔

چھٹے حصے میں نواب صاحب کیس کو لے کر فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ ادھر زنان خانے میں میر زصاحب دڈا مجیدن اور بیگم صاحبہ سے مقدمہ کے بگڑنے کی بات بتاتے ہوئے نواب صاحب کی گرفتاری تک کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے نجات کے لیے چار ہزار روپے کی مانگ کرتے ہیں

اور انھیں اسباب کی شکل میں وہ مل جاتا ہے۔اس کے بعد میر صاحب نواب صاحب کے پاس آکر استخارہ کرنے کی غرض سے ایک کمرے میں چلے جاتے ہیں اور پہلے دھندلی اور بعد میں مکمل فتح کی بات بتاتے ہیں۔ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کچہری کی خبر جاننا چاہتے ہیں اور انھیں جھوٹا واقعہ سنایا جاتا ہے کہ وہاں پانچ ہزار لوگ تھے، وکیل نے تین گھنٹے بحث کی، پورا کلکتہ شہر وہاں موجود تھا، جج کو مقدمہ خارج کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آیا، یہ ایک تاریخی مقدمہ ثابت ہوگا وغیرہ۔ وکیل اور دوسرے لوگوں کو دینے کے لیے مزید رقم کی مانگ کرتا ہے اور نواب صاحب کل آکر لے جانے کی بات کرتے ہیں۔

ساتویں حصے میں تین دن تک جشن منایا جاتا ہے اور چوتھے دن میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ اور میر جانی نواب صاحب سے وصول کی گئی رقم میں سے اپنا حصہ لینے کی غرض سے خان صاحب کے گھر جاتے ہیں۔ چار دنوں تک خان صاحب ملتے ہی نہیں ہیں اور انھیں اپنی نوکرانی اور بیوی کی مدد سے ٹالتے رہتے ہیں۔ پانچویں دن ترکیب کر کے تینوں ان سے ملتے ہیں اور رقم نہ ملنے کی صورت میں گالی گلوج سے مارپٹائی تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ اس جھگڑے میں خان صاحب کے گھر کی عورتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ جب خان صاحب کی بیگم نواب بیگم سے شکایت کی بات کرتی ہے تو تینوں وہاں سے نکل جاتے ہیں۔

آٹھویں اور آخری حصے میں نواب صاحب اور میر سعید کے درمیان گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ، میر جانی اور خان صاحب نے مل کر ان سے روپے وصول کیے ہیں اور مقدمہ تو نچلی عدالت ہی میں ختم ہو گیا، ہائی کورٹ کی بات بھی جھوٹی ہے۔ نواب صاحب کو شروع میں تو یقین نہیں ہوتا لیکن مرزا خوشامد بیگ جب خان صاحب سے بدلہ لینے کی غرض سے تمام تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خان صاحب نے چار ہزار روپے میں سے دو ہزار آپ ہی کو قرض کے طور پر دیے ہیں اور دو ہزار خود غبن کر گیا۔ آپ کے دیے ہوئے ایک ہزار روپے میں سے ہی وکیل اور دوسرے لوگوں کے اخراجات پورے ہو گئے تھے بلکہ اس میں سے بھی بچ گیا تھا۔ آپ چاہیں تو مہاجن سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ مہاجن بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر خان صاحب کو بلایا جاتا ہے۔ خان صاحب اپنے ساتھ میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ اور میر جانی کو بھی ملوث بتاتا ہے لیکن ان کے صفائی دینے پر نواب صاحب کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں اس میں شامل نہیں ہیں۔ نواب صاحب خان صاحب کو دربار سے نکال دیتے ہیں۔

اب اگر 'نوابی دربار' کے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد آزاد نے کرداروں کے نام ایسے رکھے ہیں جو اسم با مسمّٰی ہیں۔ یعنی ان کے نام سے ان کے عادات و اطوار کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر زمانہ ساز، لوٹ مار خان المعروف بہ خان صاحب، میر زا خوشامد بیگ، سیہ بخت، منحوسی وغیرہ۔ یہ تمام کرداروں کے نام سے ہی ان کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں سولہ مرد کردار ہیں اور سات نسوانی کردار۔ ان کرداروں پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ مرد کرداروں میں نواب صاحب نہایت ڈرپوک اور اپنے دماغ کا کم استعمال کرنے والے ہیں تو دوسری جانب لوٹ مار خان یعنی خان صاحب کچھ زیادہ ہی استعمال کرتے ہوئے۔ متحرک کرداروں میں خان صاحب، میر زمانہ ساز، مرزا خوشامد بیگ اور میر جانی ہیں۔ اسی طرح نسوانی کرداروں میں خان صاحب کی بیوی خانم صاحب، نواب صاحب کی والدہ خجستہ بیگم اور ددّا مجیدن متحرک نظر آتی ہیں۔ لیکن ان میں خانم اور خجستہ بیگم دو مختلف صفات و ذہنیت کی مالک دکھائی دیتی ہیں۔ ایک جانب خانم تیز، بد

مزاج اور زمانہ شناس خاتون ہے تو دوسری جانب فخستہ بیگم پرانی قدروں کو سینے سے لگائے خوف زدہ اور عزت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والی عورت ہے۔ان دونوں کرداروں کو سید محمد آزاد نے نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے۔حالانکہ کہیں کہیں پر یہ کردار اپنی عادت کے بر خلاف پیش آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کرداروں پر روشنی ڈرامے کے مکالمے سے پڑتی ہے۔خان صاحب اور ان کی بیوی خانم صاحب کے درمیان ڈرامے کے چوتھے حصے میں ہونے والی گفتگو سے ان کے کردار مکمل صورت میں سامنے آتے ہیں۔

ڈرامے میں خان صاحب کا کردار نہ صرف ایک بے ایمان اور فریبی دکھائی دیتا ہے بلکہ ایک شرابی اور عیاش انسان کی شبیہ نظر آتی ہے۔خان صاحب کی بیوی ایک بدمزاج اور ہوس کی پجارن دکھائی دیتی ہے۔چونکہ کم عمری یعنی محض تیرہ برس کی عمر میں ہی خانم کی شادی ہو گئی تھی شاید اس وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑچڑی ہو گئی ہے۔گویا اس کی زندگی میں شکایت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔جس طرح کی تکرار دونوں کے درمیان ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سماج ایک مرد اساس سماج ہے اور اس میں خان صاحب ایک ایسا مرد کردار ہے جو دنیا کی تمام عیش وآرام کی چیزوں پر اپنا حق سمجھتا اور عورتوں کے لیے کھانا اور کپڑا مل جانا کافی سمجھتا ہے۔گویا ان دو کرداروں کی مدد سے سید محمد آزاد نے مرد اور عورتوں کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ اس دور کے سماج کو بھی اجاگر کیا ہے۔

نواب صاحب کا کردار نہ تو متحرک ہے اور نہ ہی دوسروں میں تحریک پیدا کرتا ہے۔اس کے بر خلاف ان کے گھر کی عورتیں زیادہ متحرک اور فعال نظر آتی ہیں۔فخستہ بیگم اور دادا مجیدن وقفے وقفے سے حالات کے بارے میں جاننا بھی چاہتی ہیں اور خان صاحب کو مقدمے کی پیروی اور اس کے لیے رقم کی فراہمی کے لیے اپنے سامان تک دینے میں عار محسوس نہیں کرتیں۔باقی خدمت گار اپنے مالک کی اطاعت کے ساتھ ساتھ آپس میں چہل بازی اور ضرورت پڑنے پر نواب صاحب کا مذاق بھی بناتے ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید محمد آزاد نے کردار تیار کرتے وقت نہایت سنجیدگی کا ثبوت دیا ہے۔کردار کے انتخاب میں بھی اس دور کی تہذیب اور ذہنیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔

اب اگر مکالمے کی بات کی جائے تو سید محمد آزاد نے اس ڈرامے میں کردار اور موقع کی مناسبت سے طویل اور مختصر دونوں طرح کے مکالمے تحریر کیے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ کردار کی شناخت اور پلاٹ کو آگے بڑھانے کے لیے ڈراما نگار کو مکالمے سے ہی مدد لینی پڑتی ہے۔ایسا ہی اس ڈرامے میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ہاں بعض مقامات پر ہدایت کی مدد سے بھی پلاٹ کو آگے بڑھانے کا کام لیا گیا ہے۔اکثر نواب اور رئوسا نوابی اور رئیسیت ختم ہو جانے کے باوجود اپنی جھوٹی شان بچائے رکھنے کے لیے سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ انھیں قانون کے دائو پیچ سے بالکل ناواقفیت ہوتی تھی اور وہ مصاحبین کے سہارے اپنی شان کو بنائے رکھنے یا بچائے رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور مصاحبین اس کا فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔اس ڈرامے میں بھی ایسے ہی نواب صاحب کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔

اس ڈرامے میں چار متحرک نسوانی کردار نظر آتے ہیں۔ان کرداروں میں دو خادمائیں ہیں اور ایک نواب صاحب کی والدہ فخستہ بیگم اور دوسری خان صاحب کی بیوی۔سید محمد آزاد جب خواتین کا مکالمہ تحریر کرتے ہیں تو ان کا انداز مختلف ہوتا ہے۔جب یہ خواتین آپس میں باتیں کرتی ہیں تو مختلف انداز میں اور جب اپنے شوہر یا مصاحبین سے محو گفتگو ہوتی ہیں تو مختلف انداز سے پیش آتی ہیں۔

چونکہ سید محمد آزاد نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور انگریزی زبان کا بھی علم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مکالمہ نگاری میں ان علوم و فنون کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ وہ ایک طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کے مالک تھے۔ ان کی تحریر میں ان عناصر کا استعمال کثرت سے ہوا ہے بلکہ ان کی شناخت اسی خصوصیت کی بنا پر کی جاتی رہی ہے۔ اس کا عکس ہمیں ان کی مکالمہ نگاری میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب مصاحبین نواب صاحب کے سامنے محو گفتگو رہتے ہیں تو مختلف انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو مختلف مکالمے دکھائی دیتے ہیں اور جب آپس میں مفاد کا معاملہ ہو تو پھر انداز بالکل بدل جاتا ہے۔ اس کی مثال میر صاحب، مرزا صاحب، میر جانی اور خان صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو میں بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔

سید محمد آزاد نے جہاں کامیابی اور فنکاری کے ساتھ کردار کی مناسبت سے مکالمے تحریر کیے ہیں وہیں کئی مقامات پر ان سے چوک بھی ہو گئی ہے۔ کئی مواقع پر جو مکالمے تحریر کیے گئے ہیں وہ اس ماحول اور کردار کی مناسبت سے ناموزوں محسوس ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آٹھویں حصے میں بلکہ ڈرامے کے بالکل آخر میں نواب صاحب خان صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جس طرح کے مکالمے ادا کرتے ہیں وہ ان کو زیب نہیں دیتا۔

جب ہم 'نوابی دربار' کی زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد آزاد نے کردار کی مناسبت سے مکالمے کی زبان کا تعین کیا ہے۔ آزاد کو اردو زبان پر دسترس حاصل تھی جس کا اظہار یہاں ہوتا ہے۔ سید محمد آزاد ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گزارا اور وہیں مدفون ہیں۔ چونکہ ملازمت کی غرض سے اس زمانے کے بنگال بہار اور اڑیسہ میں مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مختلف علاقے کی زبانوں سے بھی واقفیت ہے۔ لہٰذا انھوں نے کردار کو پیش کرنے کے لیے اپنے مکالموں میں مقامی زبانوں کا بھی جابجا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر خان صاحب کے مکان پر خاتون کرداروں یعنی چمن اور خان صاحب کی بیوی کی مدد سے کلکتے کی مقامی بول چال کی زبان کو بھی پیش کیا ہے۔

ڈراما 'نوابی دربار' کے مکالمے کی زبان کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید محمد آزاد کو عورتوں کی زبان سے بخوبی واقفیت ہے۔ اس کا اندازہ بڑی بیگم صاحبہ، دادا مجیدن، خان صاحب کی بیوی، چمن اور خان صاحب کی بیٹی کی زبان سے ہو جاتا ہے۔ جب ایک نسوانی کردار کسی مرد کردار سے بات کرتی ہے اس وقت اس کی زبان پر نسوانی رنگ ہونے کے باوجود زبان مختلف ہوتی ہے اور جب یہ خواتین آپس میں بات کرتی ہیں تو ان کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ساتویں حصے میں جب خان صاحب کو مرزا صاحب، میر صاحب اور میر جانی پیٹتے ہیں اس دوران چمن، خان صاحب کی بیوی اور ان کی بیٹی کے بَین کرتے ہوئے مکالمے کی زبان ہے۔ اسی طرح جب ملازم آپس میں بات کرتے ہیں تو ان کی زبان مختلف نظر آتی ہے اور جب وہی ملازم نواب صاحب یا دوسرے مصاحب سے بات کرتے ہیں تو زبان میں تکلف دکھائی دیتا ہے۔ مصاحب جب اکیلے میں آپس میں بات کرتے ہیں تو اس کی زبان مختلف ہوتی ہے اور جب وہ کسی دوسرے کے سامنے آپس میں محو گفتگو ہوتے ہیں تو اس زبان بالکل الگ ہوتی ہے۔

سید محمد آزاد نے جس زبان کا استعمال یہاں کیا ہے وہ نہ صرف شستہ اردو ہے بلکہ معیاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ شرفا کی زبان ہے۔ اس دور میں س شرفا اسی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ بے ایمانی اور غبن کیے ہوئے روپے کی تقسیم کے حوالے سے جو گفتگو ہو رہی ہے اس کی زبان قدرے مختلف اور باتکلف ہے۔ اس تہذیب کے پاسدار شرفا جب نازیبا گفتگو کرتے ہیں تو بھی ان کی زبان مختلف ہوتی ہے یہاں تک کہ گالی گلوج بھی اس زبان میں کرتے

ہیں جس سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بد زبانی کر رہے ہیں۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کسی کو زبان پر دسترس ہو اور اسے مکالمہ تحریر کرتے وقت تہذیب کا پاس ہو۔

سید محمد آزاد کی مکالمہ نگاری اور اس کی زبان پر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے کردار کی مناسبت سے مکالمے تحریر کیے ہیں اور موقع، ماحول، کردار کی ذہنی کیفیت اور دوسرے کردار سے اس کے رشتے کا خیال رکھتے ہوئے مختلف زبان کا استعمال کیا گیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہاں بعض مقامات پر ان سے چوک بھی ہوئی ہے کہ مکالمے اور اس کی زبان کا تعین کردار اور موقع کی مناسبت سے نامناسب ہے۔ بعض مقامات پر خود کلامی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کئی حصے میں کرداروں کے مکالمے ہدایت کا جز بن گئے ہیں اور بعض مقام پر ہدایت مکالمے کا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر خان صاحب کے گھر میں مصاحبین کے درمیان ہونے والی مار پٹائی کے وقت کے مکالمے اور اس کی زبان کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہدایت میں پلاٹ کو پیش کرنے کی خامیاں ڈرامے میں کئی مقام پر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے ہی حصے میں میر صاحب حقہ طلب کرتے ہیں اور منحوسی حقہ لینے جاتا ہے۔ اس کے بعد ہدایت میں لکھ دیا گیا ہے کہ 'دس منٹ کے بعد'۔ دس منٹ اسٹیج خالی نہیں رہ سکتا اور دس منٹ کے بعد منحوسی حقہ لے کر آتا ہے تو میر صاحب 'پلنگ پر خر، خر، خر، خراٹے لے رہے ہیں' اور پھر اس کے بعد میر صاحب ناک سے حقے کا کش لیتے ہیں اور اس سے 'گڑ گڑ گڑ' کی آواز بھی آتی ہے۔ اسے لکھ دینا بڑا آسان ہے لیکن اس کو اسٹیج پر عملی صورت میں پیش کر پانا مشکل ہی نہیں ناممکنات میں شامل ہے۔

ڈرامے میں وقت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ جیسے ہدایت میں لکھ کر وقت ہی نہیں کئی دن کے گزر جانے کا بیان کیا گیا ہے ویسے ہی کردار کے آنے جانے کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ایک کردار کو یاد کیا جاتا ہے۔ اسے بلانے کے لیے کسی پیادے کو اس کے گھر بھیجا جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے بلکہ اس مکالمے کے بعد ہی اگلا مکالمہ اس کردار کا ہے جسے بلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جیسے دوسرے حصے میں خان صاحب کو بلانے کے لیے پیادہ کو بھیجا جاتا ہے اور وہ دوسرے ہی لمحے نہ صرف حاضر ہے بلکہ گفتگو کر رہا ہے۔ چھٹے حصے میں نواب صاحب داروغہ کو بلواتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے وہ موجود رہتا ہے۔ چوتھے حصے میں کورٹ کے منظر میں جج، خان صاحب اور پیادہ سے گفتگو میں وقفہ دکھتا ہے۔ اسی طرح منظر اچانک تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ ایک مکالمہ ایک مقام پر ہے اور دوسرا دوسرے مقام پر۔ یعنی ایک مکالمہ مردان خانے میں ہے اور دوسرا زنان خانے میں۔ چھٹے حصے میں نواب صاحب کا ایک مکالمہ ادا کر کے گھر کے اندر جانا اور اپنا کام ختم کر کے دوسرا مکالمہ بولتے ہوئے باہر آنا، درمیان میں کوئی دوسرا کردار کچھ بھی نہیں بولتا گویا یہاں بھی وقفہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی حصے میں کئی کئی مقامات پر مکالمے ادا کیے جا رہے ہیں۔ جیسے خان صاحب کے گھر کے باہر، گھر کے اندر، سڑک پر، سواری میں میر صاحب، میرزا صاحب اور میر جانی، چمن اور خان صاحب کی بیوی کے مکالمے ہوتے ہیں اور اس گفتگو میں کئی روز گزر جاتے ہیں۔

سید محمد آزاد نے اس ڈرامے میں کلکتہ کے کئی مقامات کا ذکر کیا ہے اور یہ ذکر ان مقامات کی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'کولوٹولہ' کی پان کی گلوریاں، 'بہو بازار' کی مٹھائی، 'خضر پور کا پل اور 'مچھوا بازار' کا کوٹھا وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس ڈرامے میں کئی ایسی چیزیں پیش کی گئی ہیں جس کا وجود نظر نہیں آتا اور اس سے ڈراما نگار کی بے توجہی یا کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب خان صاحب عدالت کے اخراجات کے لیے رقم

طلب کرتے ہیں تو نواب صاحب انھیں ایک ہزار کا نوٹ دیتے ہیں۔اسی طرح خان صاحب کسی کو پینتیس (35) روپے کا نوٹ دے کر رخصت کرتے ہیں۔اب ذرا غور کیجیے کہ کیا 1878 سے قبل کا ایک ہزار اور پینتیس روپے کے نوٹ ہوا کرتے تھے۔

ڈرامے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ ڈرامافن کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔کیونکہ کئی بار ایک ہی منظر کو ایک سے زیادہ حصے میں تقسیم کر دیا گیا ہے تو ایک حصے میں کئی مناظر بیان کر دیے گئے ہیں۔مکالمے میں ہدایت اور ہدایت میں مکالمہ کی آمیزش ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامانگار کو اسٹیج پر ڈراما پیش کرنے یا ہونے کا علم کم ہے۔ڈرامے کو منظر کے بجائے حصے میں جس طرح سے تقسیم کیا گیا ہے وہ اسٹیج کے بجائے واقعات کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔حالانکہ اس تحریر سے کم و بیش 26 برس قبل اردو میں 'اندر سبھا' کی شکل میں مکمل ڈرامانہ صرف ضابطۂ تحریر میں آچکا تھا بلکہ اسے کامیابی سے کھیلا بھی جا چکا تھا اور اس کی مقبولیت اس قدر تھی کہ اس زمانے میں ڈراما کو اندر سبھا کہا جانے لگا۔دوسری جانب 'نوابی دربار' سے قبل بنگال کے شہر ڈھاکہ میں کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں اور یہاں 'ناگر سبھا' اور 'صولت عالم گیر' جیسے ڈرامے لکھے جا چکے تھے۔بنگال کے شہر کلکتہ میں اس سے کم و بیش ایک سو برس قبل ڈراما کھیلے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔اس کے باوجود سید محمد آزاد کا اسٹیج سے ناواقف ہو کر ڈراما لکھنا چہ معنی دارد۔

سید محمد آزاد کو فارسی زبان و ادب کا خاصا علم تھا جس کی عکاسی اس ڈرامے میں بھی ہوتی ہے۔اکثر مقام پر فارسی کے قول، مصرعے یا اشعار ملتے ہیں جو زیادہ تر مقامات پر بامعنی لگتے ہیں تو کہیں کہیں پر کھٹکتے ہیں۔'نوابی دربار' کا خاتمہ ڈرامے کی مانند نہ ہو کر ناول یا افسانے کی طرز پر ہوتا ہے۔ڈرامے کا خاتمہ یا تو مکالمے پر ہوتا ہے یا پھر حرکات و سکنات اور چہرے کے تاثرات کی پیش کش پر۔خاتمے میں اس کی تلخیص یا نتیجہ نہیں بیان کیا جاتا لیکن 'نوابی دربار کا خاتمہ میر جانی کے آخری مکالمے کے بعد نتیجہ سخن پر کیا گیا ہے:

''نتیجہ سخن یہ ہے کہ خان صاحب اپنی بے ایمانی، خود غرضی، ہر ایک کے ساتھ چالاکی کرنے سے ذلیل و خوار، بدنام ہو کر نکالے گئے۔نواب صاحب نے اپنی حماقت سے بلا دریافت اصل حال۔اگرچہ خان کو نکالا مگر سب موذیوں کا پورا استیصال نہ کیا۔میر و مرزا وغیرہ اپنی چالاکی سے جو لکے توں خیر خواہ بنے رہے اور آخر اس گھر کو تباہ کر کے رہے۔

سگ وزیر و گربہ مرح و موش دربانی کند

ایں چنیں ارکان دولت خانہ ویرانی کند

اس روشنی میں اگر سید محمد آزاد کے 'نوابی دربار' پر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جائے کہ یہ مکالمے کی شکل میں لکھی ہوئی ایک ایسی تحریر ہے جسے ایک اچھا اور ماہر ہدایت کار ترمیم و اضافے کے ساتھ اسٹیج پر پیش کر سکتا ہے تو اسے ڈرامے کے زمرے میں رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔حالانکہ اس کی موجودہ شکل پر کئی لوگوں کو ناول کا شائبہ نظر آیا ہے تو کئی نے اسے فسانہ کہا ہے اور اس کا احساس اس کے مطالعے کے دوران بھی ہوتا ہے۔لیکن چونکہ اس میں ڈرامے کا عنصر غالب ہے اس لیے ہم اس کا شمار ڈرامے کے طور پر کر سکتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔اس تحریر کو اہمیت اس لیے

بھی حاصل ہے کہ لکھنؤ میں 'اندر سبھا' کے بعد 'نوابی دربار' لکھنؤ کے 'اودھ پنچ' میں ڈرامائی صورت میں شائع ہونے والی مختلف تحریر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ڈرامے نے اس زمانے کے لوگوں کو زیادہ متاثر کیا لیکن فن کی کسوٹی پر ڈرامے کچھ کمیاں نظر آتی ہیں۔

سید محمد آزاد نے طنز و مزاح کے پیرائے میں جو تحریر سپرد قلم کی ہیں وہ نہ صرف اپنے زمانے کی نمائندگی کرتی ہیں بلکہ بعد کے قلم کاروں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔ انھوں نے ڈکشنری لکھی تو نہ صرف یہ کہ انگریز اور برطانوی تہذیب کا خاکہ اڑایا بلکہ اپنے ہم وطنوں کو تلقین کی کہ اس کی نقل میں اپنی مثبت تہذیب و ثقافت کو نہ چھوڑیں۔ جو خطوط لکھے ان میں اپنے ملک اور مشرقی خواتین کی عفت و عظمت کا پاس رکھتے ہوئے مغربی تہذیب کی دلدادہ عورتوں کی ذہنیت اور ترقی کے نام پر تنزلی کو نہایت پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔ خود نوشت کے انداز میں ہندوستان میں مختلف پیشے سے وابستہ لوگوں کی قلعی کھول کے رکھ دی ہے۔ اور ڈرامے کے پیرائے میں پیش کی گئی تحریر کے ذریعے زوال آمادہ معاشرے اور فریب میں مبتلا رؤسا و امرا کے حالات بیان کر دئے ہیں۔ آزاد کا انداز بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ ان میں موجود زہر بھی قند معلوم ہوتا ہے اور قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ ان میں سے بیشتر نگارشات 'اودھ پنچ' میں شائع ہوئیں اس لیے اس کا علم ہوتا ہے کہ 'اودھ پنچ' کے قارئین کو سید محمد آزاد کی تحریر کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ اس کے باوجود سید محمد آزاد پر جس طرح کام ہونا چاہیے ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تحریروں کا از سر نو محاسبہ کر کے ان کا مقام متعین کیا جانا چاہیے۔

☆☆☆